''منظور میری آنکھ
کے ہیں زاوئے الگ''

ڈاکٹر مُعید الظَّفر

خاموشی بولے منظور ایسا کچھ کر مطلب کیا ہے، دفتر کے دفتر لکھنا[1]

حکیم منظور (۱۴ اکتوبر ۱۹۳۷ء-۲۱ دسمبر ۲۰۰۶ء)[2] ایک اعلیٰ پایہ کے اردو شاعر، سخن آفرین، صحافی اور ایک ناظم تھے۔ ان کی پیدائش حضرت آخوند ملاّ حسین خباز مجددی نقشبندی کشمیری رحمہ اللہ (متوفی ۱۰۵۲ھ/ ۱۶۴۲ء) جو کہ سترہویں صدی عیسوی کے ایک غیرت مند کشمیری عالم دین اور باکمال فارسی شاعر ہیں کی آخری آرام گاہ کے قرب میں راجوری کدل سری نگر میں ہوئی۔ ملاّ خباز رحمہ اللہ فارسی شاعر تو تھے مگر سماع و رقص سے شدید

مخاصمت رکھتے تھے اور سماع ورقص کے بطلان میں ہدایت الاعمیٰ نامی کتاب بھی حوالہ قرطاس کی جو کشمیر اور بیرون کشمیر میں فی زمانہ نہایت مشہور اور معرکۃ الآراء رہی۔ منشائے الٰہی کہ حکیم منظورؔ نہ صرف اس اللہ والے کی ہمسائیگی میں پیدا ہوئے بلکہ انہوں نے اپنا عہد طفولیت اور لڑکپن اسی ولی اللہ کے محلّہ میں گزار کر عین شباب میں ان کی طرح شاعری کی عریض وادیوں میں قدم بھی رکھا۔ ملاّ خباز رحمہ اللہ کی زمین مذہبی تھی جبکہ منظورؔ جذبوں اور احساسات کی زبان بولتے تھے۔

منظور کے والد گرامی حکیم علی محمد شہر سری نگر کے معروف طبیب تھے۔ والدہ کا نام صدیقہ بیگم تھا۔ ان دو نے اپنے نورِ چشم کا نام حکیم محمد منظور رکھا جو منظورؔ کے ادبی دنیا میں قدم رکھتے ہی سمٹ کر حکیم منظورؔ ہو گیا۔ منظورؔ نے اسلامیہ ہائی اسکول سری نگر سے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور ایس پی کالج سری نگر سے ایف ایس سی تک تعلیم پائی۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ادیب فاضل اور پھر بی اے کی ڈگری بھی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ان کے اساتذہ میں کشمیری زبان وادب کے بلند پایہ نقاد اور ادیب مرحوم پروفیسر محی الدین حاجنی (متوفی ۱۹۹۳ء) بھی شامل ہیں۔ بڑے بڑے اساتذہ اور اداروں سے تعلیم حاصل کرنے کے باوجود شاید یہ حکیم منظور کی خود دار اور خود پسند طبیعت کا ہی پرتو تھا کہ انہوں نے سخن وری

میں کسی استادِ فن کے سامنے باقاعدہ زانوئے تلمّذ تہہ کرنا گوارا نہیں کیا۔

منظور نے ابتداء سے ہی سرکاری ملازمت کو ترجیح دی اور کئی اعلیٰ عہدوں پر فائز بھی رہے۔ وہ ایک کلیرک سے شروع کر کے کسٹوڈین آف ایویکیویز پراپرٹی (جموں)، اسسٹنٹ کمشنر، سیکریٹری جموں ڈیولپمنٹ اتھارٹی، ریذیڈنٹ کمشنر حکومت جموں وکشمیر (دہلی)، ڈائریکٹر ایگریکلچر ڈپارٹمنٹ حکومت جموں وکشمیر، ڈائریکٹر اسکول ایجوکیشن اور بالآخر ڈپٹی کمشنر بارہمولہ کے عہدے تک جا پہنچے۔ بڑے سرکاری عہدوں پر فائز رہنے کے باوصف ان کے ادبی میلان میں گرچہ کوئی کمی واقع نہیں ہوئی البتہ ان کے مزاج میں ابتدائی دور سے ہی ضد اور تحاکمانہ عناصر بآسانی دیکھنے کو ملتے رہے۔ بقول قاضی غلام محمد ''مجھے حکیم منظور پر کبھی کبھی رحم بھی آتا ہے۔ کرسی نشینی اور دفتری رَکھ رکھاؤ کے لئے اس کو اپنی حساس طبیعت پر کتنا جبر کرنا پڑتا ہوگا؟''[۳] حکیم منظور نے بھی اس احساس کو ایک شعر میں یوں زبان دی ہے:

منظور دل کی بات میں کہتا ہزار رنگ سوچوں مگر ملازمِ سرکار کون ہے؟[۴]

حکیم منظور کا ادبی سفر ۱۹۵۵ء سے شروع ہوتا ہے۔ افسانہ نگاری سے اپنے سفر کا آغاز کرنے والے منظور اردو شاعری خصوصاً اردو غزل کے

ہی ہو کے رہ گئے۔ ۱۹۵۶ء میں ان کی لکھی کہانیاں ''مارتنڈ'' اور ''کشمیر'' جیسے مقامی اخباروں کے علاوہ دہلی کے ہفت روزہ ''چترا'' میں بھی شائع ہوتی تھیں۔ ۱۹۶۴ء سے انہوں نے باقاعدہ شاعری کا آغاز کیا۔[۵] یہ وہ دور تھا جب شعراء پر ترقی پسندی کا غلبہ تھا اور اکثر ادیب اور شاعر بقول منظور ''ادب کو ارضِ ماسکو کی جنت کی مدح سرائی اور نغمہ خوانی کے لیے وقف'' کیا کرتے تھے۔[۶] منظور کی طبیعت پر یہ چیز گراں گزری اور انہوں نے ترقی پسند رجحانات سے پہلو تہی کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔ جدیدیت بھی ان پر حاوی نہ ہو سکی۔ ان کی سرشت نے اس کے رجحانات کو بھی تسلیم نہیں کیا۔ وہ خود جدیدیت کے حامیوں پر نقد کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ ''جدیدیوں نے اس زبان [اردو] کو گھوڑا سمجھ کر اس کی سواری شروع کی۔''[۷]

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ منظور عاشقِ اقبال تھے اور ان کے فکر و کلام سے بہت متاثر تھے البتہ ان کے اپنے ادب پاروں پہ اقبال کا رنگ زیادہ غالب نظر نہیں آتا۔ وہ ہر دم اقبال کا دفاع تو کرتے نظر آتے ہیں[۸] مگر اقبال کی طرح انہوں نے مذہب کو اپنے فکر و فن کا ماخذ نہیں بنایا۔ اقبال کے مقابلے میں منظور پر باقی کا اثر ہو یدا ملتا ہے۔ منظور خود اپنے بارے میں

باؔنی کی رائے کو ہی اہمیت دیتے ہیں۔ سخنِ برف زاد کے پیش لفظ میں وہ اپنے بارے میں باؔنی کی رائے کو بطور سند نقل کرتے نظر آتے ہیں۔

منظوؔر نے کل ۱۵اردو شعری اور نثری مجموعے قلمبند کیے جن کے نام یوں ہیں: نا تمام (۱۹۷۷ء)؛ لہولَمس چنار (۱۹۸۲ء)؛ برف رُتوں کی آگ (۱۹۹۰ء)؛خوشبو کا نام نیا (۱۹۹۱ء)؛ پھول شفق آنگن کے (۱۹۹۳ء)؛شعر آسمان (۱۹۹۷ء)؛ صبح: شفق: تلاوت (۱۹۹۸ء)؛ برف آفتاب (۲۰۰۰ء)؛ سخنِ برف زاد (۲۰۰۳ء) ،قلم: زبان: شگاف (۲۰۰۵ء) اور چہار ضرب(۲۰۰۹ء)۔ اقبال: ایک تذکرہ (۲۰۰۰ء)اور *The Land of Apples* منظور کی نثری کاوشیں ہیں۔ نثر میں ان کے ہفتہ وار اخبار ''خبر و نظر'' (کشمیری/ اردو/ انگریزی ۱۹۹۵ء-۲۰۰۶ء) اور دوسرے اخبارات ورسائل میں چھپے ان کے مقالات بھی قابل ذکر اضافہ کرتے ہیں۔ کشمیری میں ان کے دو شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں جن کے نام یوں ہیں: (۱) مُے چُھو وَرتَن تے (۱۹۹۸ء) اور (۲) دپیؤمَے بالہِ یارَس (۱۹۹۹ء)۔

عجب حقیقت ہے کہ ان معیاری تحریری کاوشوں کے باوجود بھی حکیم منظوؔر کو اردو دنیا میں وہ مقام نہیں مل سکا جس کے وہ مستحق نظر آتے ہیں۔ وہ خود بھی اس محرومی کا شکوہ کرتے ہیں اور دعوی دار ہیں کہ وہ ''بہت سارے

لوگوں کے مقابلے میں بہتر ہونے کے باوصف پیچھے رہ گئے۔'' البتہ وہ پر امید ہیں کہ بالآخران کی ''شاعری کا بہتر استحسان ہوکر ہی رہے گا۔''[9] ان کے دل کی یہ ٹیس جہاں سخنِ برف زاد میں قاری کو صاف محسوس ہورہی ہے وہاں شعر آسمان کا پس نوشت بھی اس کسک سے لبالب بھرا ہوا ہے لیکن اُس میں اُن کا لہجہ سخت اور تنقیدی بھی ہے۔

حکیم منظور اصل میں غزل کے شاعر تھے البتہ انہوں نے نظمیں بھی لکھیں اور نثر کی طرف بھی متوجہ رہے۔ زندگی کے آخری برسوں میں وہ رباعی جیسی مشکل صنف کی طرف متوجہ رہے۔ انہوں نے نظموں کے دو ارمغان سجھائے۔ ''پھول شفق آنگن کے'' ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ تھا۔ اس میں اکثر نظمیں آزاد ہیں۔ ''برف آفتاب'' ان کا دوسرا مجموعہ ہے جو پہلے مجموعہ سے نسبتاً ضخیم ہے۔ منظور کی غزلیں روایت سے ہٹ کر، رومانیت سے مبرا اور الفاظ اور تراکیب کے انتخاب میں پر تکلف ہونے کے باوجود آدمی کے کانوں میں رس گول لیتی ہیں۔ وہ دقیقہ سنج بھی ہیں اور زیرک بھی۔ وہ حدود و قیود سے آزاد رہ کر غیر مانوس لب ولہجہ اختیار کرنے میں زیادہ مزہ لیتے ہیں اور اپنے قاری کو نہ صرف اپنے لسانی اجتہادات سے چٹخارا لیتا ہوا چھوڑ دیتے ہیں بلکہ بارہا اُن کا خیال سنتے ہی سامعی اُچھل پڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ بقول پروفیسر قدوس جاوید اُن '' کی غزل میں

اپنی زبان، زمین، معاشرہ اور ثقافت کے تحفظ، تعبیر، تہذیب اور توسیع کا جذبہ...... حکیم منظور کی غزل کا بنیادی تخلیقی جوہر (Creative Essence) قرار پاتا ہے اور یہی حکیم منظور کے انفراد کا نقشِ اوّل ہے۔''[10]

منظور کی شاعری میں ان کی والہانہ سماجی اور ثقافتی وابستگی عیاں ہے۔ ان کی اکثر تشبیہات، استعارے اور ڈکشن کشمیری الاصل ہیں۔ یہ ان کا تخلیقی جوہر ہی ہے کہ منظورؔ تمام کشمیری اردو شعراء سے الگ اور انوکھے نظر آتے ہیں۔ ان کی تفرید اس درجہ شدید ہے کہ وہ ایک قاری کو اپنی لسانی نیرنگی اور تکلف میں اس قدر باندھے رکھتے ہیں کہ وہ ان کے کلیدی مضمون کشمیر سے غیر شعوری طور پر محبت کرنے لگتا ہے۔ ان کا کلام جہاں کشمیر کے ذکر سے پُر ہے وہیں ان کے کلام میں کشمیری قوم کی عظمت رفتہ اور درد کا ملا جلا زیریں احساس ہر جگہ محسوس ہوتا ہے۔ وہ کشمیر کے بارے میں خود جذباتی ہیں اور اپنے سامعی کے جذبات برانگیختہ کرنا بھی خوب جانتے ہیں۔

مجھ کو امرودوں سے رغبت اور آموں سے بھی پیار   ذکر ٹیڑھا سیب کا آئے تو جذباتی بھی ہوں

ان کی غزل کشمیری مقامات اور کشمیر کی خوبصورتی کے بیان سے مملو ہے۔ اگر یوں کہا جائے کہ ان کے فن پاروں کے پس منظر میں کشمیر ایک متحرک تصویر کی مانند کام کر رہا ہے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ حکیم منظورؔ اردو میں

غزل کہنے کے باوجود بھی کشمیری شاعر نظر آتے ہیں۔ ان کا لینڈ اسکیپ کشمیری، ان کے الفاظ کشمیری اور ان کے مناظر کشمیری ہیں:

تازہ دم نمکین چائے اور کانگڑی ہنستی ہوں برف، گل بوقہقہے، پھر مدّعا کیا پوچھنا[11]

منظورؔ اکثر اپنے ہم عصر کشمیری شعراء کے برعکس ایک ذمہ دار کشمیری کی طرح اپنی قوم کی بدحالی کو نہ صرف محسوس کرتے ہیں بلکہ اس کربناک احساس کو الفاظ کے پیکر میں ڈھال کر وہ اسے اردو دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ وہ نہایت شستہ زبان میں ایک کشمیری کی کسم پرسی اور اس کی پریشان حالی کو پیش کر کے بڑی حد تک اپنی ذمہ داری کو ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں:

ہر ایک سمت کھلی شورشوں کے سائے ہیں ہر اک زبان پہ رواں ہے تو کلمۂ تقصیر
اک اضطراب سا جہلم کے پانیوں میں ہے ڈُلر کی پوری جبیں پر نہیں کوئی تنویر
ہے ڈل میں خُنکی نہ ہے آبِ ہارون میں مزا نہ شیش ناگ کے پانی میں اب کوئی تطہیر
کچھ ایسا لگتا ہے دھندلا گیا ہے حسنِ نشاط ہے اک فسانۂ شب شالیمار کی تنویر[12]

***

تمہارے آموں پہ کیا گزرتی ہے، جانتا ہوں لہو ہیں خرمٹ میرے موسم کی سازشوں سے[13]

قاضی غلام محمد نے حکیم منظور کی غزلوں کا تجزیہ کرتے ہوئے

جولطیف اشارے دیے ہیں وہ بہت ہی معنی خیز ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''حکیم منظور کی غزلوں کے اشعار اکثر آبی رنگوں کی تصاویر سے زیادہ روغنی رنگوں کی تصاویر (oil paintings) سے مشابہت رکھتے ہیں۔ یعنی 'نزدیک' سے دیکھئے تو سطح کھردری لگتی ہے لیکن مناسب 'فاصلے' سے دیکھئے تو سطح صاف اور شفاف نظر آئے گی اور معانی کی تہیں بھی خود کو ظاہر کر دیں گی۔''[۱۴] انہی ''روغنی رنگوں کی تصاویر'' کو پروفیسر مجید مضمر نے ''سخت اخروٹ'' کہا ہے۔[۱۵] انہوں نے منظورؔ کی شاعری کے بارے میں ''سخت اخروٹ'' کے ساتھ ساتھ اس کے کشمیری مترادف ''ووٹٹ ڈوٗن'' سے بھی مزید اشارہ دیا ہے۔ ہماری نظر میں منظورؔ کا بہت سا ایسا کلام موجود ہے جو اسی ''سخت اخروٹ'' کے مانند ہے۔ ایسے کلام میں نہ تو موسیقی دکھتی ہے اور نہ ہی اس کو بہ آسانی رواں پڑھا جا سکتا ہے۔ مثلاً:

ہے گرچہ آج بھی کل ہی کی طرح یک سول ہے گرچہ آج بھی ناگفتہ بہ ہمارا حال
ہے گرچہ رُوح فسردہ، دل ایک غم آباد ہے گرچہ چہرۂ ماضی نظر کا ایک وبال
ہے گرچہ ہر کوئی منظر سواد سے خالی ہے گرچہ شورہ صفت، گرد اب بھی آبِ زوال
ہے گرچہ ذہن میں آباد کوئی اندیشہ ہے گرچہ خوں کی حرارت میں کچھ لپک نہ اُبال[۱۶]

ہمارے اس تاثر کے برخلاف پروفیسر مجید مضمر نے منظورؔ کے ایسے اشعار کو

''بہت زیادہ لذیذ'' محسوس کیا ہے۔ بقول ان کے ''حکیم منظورؔ کی شاعری کا ست بھی کہیں کہیں سخت ترین لسانی اور ہیئتی چھلکے میں چھپا ہوا ہے۔اس ست کو نکالنے میں اشتیاق، محنت اور تلاش کا عمل بجائے خود ایک جمالیاتی عمل ہے۔''[۱۷] پروفیسر غلام رسول ملک نے شعر آسمان کے پیش لفظ میں جذبات واحساسات اور طاقتور ذہانت کی ''شاعری میں شعوری کوشش، کسب ومہارت اور فنکارانہ تزئین کاری کے آثار نمایاں طور پر واضح نظر'' آنا تسلیم کیا ہے۔ انہوں نے حکیم منظور کی شاعری کو اسی قبیل سے بتایا ہے اور اس میں ''جذبہ واحساس کی ایک زیریں رَو اور ایک متجسس اور فعال ذہانت'' کا اس کو ''تانا بانا فراہم'' کرنا قبول کیا ہے۔ بقول پروفیسر ملک ''یہ دونوں عناصر ان کی نادر شخصیت اور ایک مخصوص انفرادی فکر ونظر کے آئینہ دار ہیں۔''[۱۸]

منظورؔ کی وفات کے بعد ان کے فرزند اور ان کی اہلیہ نے ان کی رباعیات کا مسودہ تلاش کر کے اس پر رفیق راز کا مختصر ترین تبصرہ شامل کر کے ۲۰۰۹ء میں اس کو شائع کروایا۔ اس کتاب کا نام ''چہار ضرب'' رکھا گیا اور اس میں منظورؔ کی رباعیات کا معتد بہ حصہ شامل ہے۔ ان رباعیات میں بھی کشمیر اور اس کے باغات ، پانیوں اور خوبصورتی کا تذکرہ ملتا ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ان رباعیات میں وہ پکڑ نظر نہیں آتی جو

ان کی غزلوں میں نمایاں ہے۔

بے آب کبھی ہو نہ یہ چشمۂ شاہی
بے رنگ کبھی آنکھ نہ ہو اس ڈل کی
ہو ہی نہ پہلگام کبھی بے سایا
مولا نہ ہوگلمرگ میں پھولوں کی کمی [19]

***

قطرے میں مرے پورے سمندر کا خمار
ہے میرا وُلر جیسے کہ کُھلتا اسرار
یہ چشمے چمن اور شبِ شالیمار
یہ اونچے سفیدے مرے، میرے ہیں چنار [20]

حکیم منظورؔ کے کلام کو اگر بغور دیکھا جائے تو یہ کہنا کہ وہ صرف اپنے شہر کے حالات پر نوحہ خوانی کرتے ہیں صحیح نہیں ہوگا۔ ان کے سینے میں ایک زندہ انقلابی حکیم منظورؔ موجود ہے۔ جو تحرک کا قائل اور انقلاب کا متمنی ہے۔ وہ اعلیٰ انسانی اقدار کا علمبردار اور ان کی بازیافت کا منتظر ہے۔

میرے کشمیر میں منظورؔ اب پیدا نہیں ہوتے نہ میرک شاہ اندرابی نہ انور شاہ لولابی [21]

***

میں اپنے شہر کے ان عالموں سے سیکھ پاؤں کیا ہے جن کی سوچ بازاری، ہے جن کا لہجہ بازاری [۲۲]

ان کا شہر آشوب ۳۷ بندوں کا مجموعہ ہے جو ایک باحس قاری کو کشمیری قوم کی اندوہ ناک حالت سے نہ صرف آگاہ کرتا ہے بلکہ اس کو جنجوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ یہ شہر آشوب ۲۰۰۰ء میں چھپا جوان کی کتاب 'برف آفتاب' کے آخر میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ شہر آشوب شاعر کی حساس طبیعت اور اس کے کرب کو بیان کرتا ہے۔

ہمارے حصّے میں وہ دور آ گیا بھائی کہ جس میں علم و ذہانت ہے اک خطا بھائی
نہ دوستی کا بھروسہ نہ دشمنی کا یقیں کچھ ایسا ٹوٹا ہے ہر ایک سلسلا بھائی [۲۳]

حکیم منظور کی شاعری میں گزشتہ زمانے کے خلوص، سچائی اور سادگی بار بار آنکھوں کے سامنے گزرتی ہے۔ ان کو اپنے دور کا نہ صرف ادراک حاصل تھا بلکہ وہ بدلتے وقت کے ساتھ ہو رہے تغیر اور اِس تغیر کے عمل میں فوت ہو رہی قدروں سے بھی آگاہ تھے۔ وہ پرانی قدروں کی حفاظت کرنا اپنی ذمہ داری مانتے ہیں اسی لیے وہ ہر کھوئی ہوئی چیز پر سرد آہ بھرتے نظر آتے ہیں۔

عمل کے بل پہ کوئی جی نہیں سکتا　　کسی کی ہو نہیں حاصل اگر طرفداری
خلوص! علّتِ بیجا ہے، حرفِ مہمل ہے　　پسند ہے نئے شاہوں کو بس اداکاری [۲۴]

وہ اپنے ادب پاروں میں صرف جمالیات کے پہلو کو ہی نہیں دیکھتے بلکہ وہ شاعری کو انسانی اقدار کی بلندی اور کردارسازی کا وسیلہ بھی سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں ذاتی تجربے شاعر کے مرکزی خیال کو بنیاد فراہم کرتے نظر آتے ہیں۔ یعنی اگر یوں کہا جائے کہ وہ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں تو شاید غلط نہ ہوگا۔

خباثتوں کا عجب اعتبار ہے، توبہ　　شرافتوں میں رذالت شمار ہے، توبہ
شقاوتوں سے مزّین ہیں علم کے دیوان　　حماقتوں سے خرد ہمکنار ہے، توبہ [۲۵]

''سخنِ برف زاد'' کے پیش لفظ میں منظور اپنے فن اور کلام پر خود تبصرہ کرتے ہوئے اس بات کو قبول کرتے ہیں کہ وہ اپنے ہر شعری مجموعے میں ''خود کو نہ دہرانے'' کی شعوری کوشش کرتے ہیں۔ وہ اس نہ دہرانے کے عمل میں کامیاب ہونے کی بنیادی وجہ کشمیری تہذیب وتمدن کی زرخیزی

بتاتے ہیں۔ وہ اپنے تجربوں کی رنگارنگی سے واقف ہیں اور ان تجربوں کو ہی اپنی کامیابی قرار دیتے ہیں۔ [۲۶] پروفیسر مجید مضمر مرحوم ان کے تجربوں پر یوں تبصرہ کرتے ہیں:

> حکیم منظور نے غزل کی داخلی اور خارجی ساخت میں بعض توجہ طلب تجربے کیے ہیں۔ بحروں میں تنوع کے علاوہ انہوں نے ایک ایسا مکالماتی انداز متعارف کیا جس میں استفسار اور جواب دونوں ایک مصرعے یا ایک شعر میں اس طرح سماجاتے ہیں کہ اس کے اختصار پر تفصیل رشک کرتی ہے۔ بعض غزلوں میں ہم صوت الفاظ مصرعوں کے شروع میں ہی استعمال اس طرح کا ہے کہ اس پر کرافٹ کا گماں نہیں گزرتا۔ یہاں صرف سوال و جواب کے حامل مصرعوں کو مثال کے طور پر پیش کیا جارہا ہے:
>
> سوال: خوشبو ہوا کی کیسی؟ جواب: سب زندہ دار ہو کیا؟
>
> سوال: پیکر شفق کا کیسا؟ جواب: عکس خیال کیا ہے؟ [۲۷]

پروفیسر مجید مضمر اس نوع کی شاعری کو ''موسیقی کے سحر سے آزاد کرنے اور اسے سماعت کے بجائے قرأت اور بصارت سے وابستہ کرنے کا

تجربہ‘‘ بتاتے ہیں۔[۲۸]

حکیم منظورؔ اپنے سماج میں کھوکھلے ’’کرداروں‘‘ کی نقل وحرکت تو دیکھتے ہیں مگر وہ ان کرداروں کو بے روح کہتے ہیں۔ وہ اس گیتی کو ایک اسٹیج مانتے ہیں اور اس اسٹیج پر کرداروں کی بھر پور تگ ودَو کو محسوس بھی کرتے ہیں۔ البتہ ان کو یہ کردار بے روح معلوم ہوتے ہیں اور اس بے روح نشست وبرخاست کو وہ ’’کہانی روٹھ گئی ہے‘‘ کہہ کر اس روح کی بازیافت کے لیے سرگرداں نظر آتے ہیں۔

منظورؔ کا کوئی بھی شعری مجموعہ ہاتھ میں لیجیے تو ہر مصرعہ میں شاعر کے داخلی اور خارجی ماحول میں تصادم نظر آیے گا۔ وہ گزرتے وقت کی رفتار سے مضطرب ہیں اور پریشان بھی۔ وہ اپنی شخصیت کو زمانے کے آئینہ میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور آئینہ دھندلا پا کر پریشان ہوتے ہیں اور چیخ اٹھتے ہیں۔ ان کی یہی چیخ ان کے فن میں ’’دُکھ‘‘ کا احساس پیدا کرتی ہے۔ وہ اپنی قلبی کیفیتوں کو الفاظ میں پیش کرنے کی مسلسل کوششیں کرتے ہیں اور الفاظ ومروجہ تراکیب میں اپنے اندر چل رہی کشمکش کی ترسیل کی قوت نہ پا کر نئی تراکیب تراشنے کا عمل شروع کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ یہ مروجہ اسلوب وڈکشن کی تنگ دامانی ہی ہے کہ منظورؔ ہر مجموعہ میں ایک اچھا خاصا نیا ذخیرۂ تراکیب لے کر آتے ہیں۔

علامتوں کے بدن پہ سارا غبار رسم و رواج کا تھا جو لفظ بھی میرے ہاتھ آیا غلط کے مہمل سماج کا تھا

منظورؔ ہر دم اپنی یادداشت کو کریدتے معلوم ہوتے ہیں اور بڑی خوبصورتی کے ساتھ زبان کے تخلیقی استعمال کے ذریعے اپنے گزرے زمانے کو ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنی روایات اور اپنی قوم کے گم شدہ اقدار کا ماتم کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے جذبات اور احساسات میں شدت پائی جاتی ہے۔ اس بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا اعتراف بھی قابل توجہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''حکیم منظورؔ کے کلام میں اظہار کی توانائی اور جذبے کی حلاوت نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا۔''[۲۹]

ان کی غزلیں اور نظمیں شاعر کے سینے میں ایک بچے کا سا دل ہونے کا احساس دلاتی ہیں۔ اکثر سنجیدہ شاعر کبھی کبار nostalgic ہوتے ہیں مگر جہاں تک میں سمجھتا ہوں حکیم منظورؔ پر اس عنصر کا غلبہ کچھ زیادہ ہی ہے۔

پہلے مکاں تھے چھوٹے مکینوں کے دل بڑے پہلے ہمارے شہر کا نقشا یہی اور تھا[۳۰]

***

مُشامِ جاں معطّر جن کی خوشبوؤں سے ہوتا تھا رلاتی ہے مجھے ان عنبری سیبوں کی نایابی[۳۱]

اسی طرح 'پھول شفق آنگن کے' صفحہ ۵۸ پر ہمیں جو طویل نظم ملتی ہے وہ بھی پوری طرح nostalgia کے عنصر سے لبریز ہے۔ مثلاً:

ہم بچے تھے
برف کبھی چپکے سے راتوں کے اندھیارے میں آتی تھی
اماں صبح سویرے سب کی کانگڑیوں میں شعلے سلگایا کرتی تھی
کھڑکیوں کے پٹ کھلتے تھے
اور سماوار کی ابھلتی چائے کی خوشبو۔۔۔
میری اماں اب بوڑھی ہو کر میرے بچوں کی دادی ہے
میرے ابا جنت بستی کے باسی ہیں
میرے بچوں کی ماں گاؤں کے اسکول کی استانی ہے
خوشبو چائے کی کیتلیوں سے اڑتی نہیں ہے
میری بیوی کانگڑیاں سلگانے کے فن سے عاری ہے
الٹ پلٹ ہر بات ہوئی ہے
باقی ہیں کردار کہانی روٹھ گئی ہے [۳۲]

حکیم منظور کے کلام میں ہندی، پنجابی، کشمیری، فارسی، عربی اور یہاں تک کہ انگریزی زبان کے چیدہ چیدہ الفاظ بھی ملتے ہیں۔ انہوں نے ہر سطح پر آزادی کو پسند کیا ہے۔ ان کا یہ جملہ کہ ''میں جو ہوں وہی ہوں اور

اتنا ہی ہوں اور اتنا ہی رہنا چاہتا ہوں۔‘‘ [۳۳] خود ان کے لااُبالی مزاج کو واضح کرتا ہے۔ زبانوں کی اس بوقلمونی نے ان کے احساسات اور جذبات کو مزید صاف اور بااثر اظہار دیا ہے۔

منظور اپنی ہستی سب سے اونچی ہے   اس کو کمتر کہنا ہے اَپمان بڑا [۳۴]

***

ہے لاکھوں بولتے رنگوں کا درپن   پھِرن پہنتی ہوئی پریوں کا آنگن [۳۵]

***

منظور میں روتا ہوں کہ کس فائل میں گم ہے   وہ دل کہ میرے ناز اٹھانے کے لئے تھا [۳۶]

***

بجز جذبات کے منظور آخر   کرے گا اے قلم کیا تجھ کو اَرپن [۳۷]

***

دھرتی یہ آکاش سے پوچھے کیا میری نرمی علت ہے   کیا کارن ہے سنگستاں پر کیوں نہیں چلتا کوئی ہل [۳۸]

***

وہ کیا بات بنائے صاحب، جو لفظوں سے ہارا ہو   وہ کیا فصل اگائے صاحب جس کے پاس ہو ٹیڑھا ہل
لہجہ کچھ ہو میرے کانوں میں رس گھولتی ہے منظورؔ   کشمیری کی کتھ، ہندی کی بات ہو یا پنجابی گل [۳۹]

اپنے کلام میں منظورؔ نے اضافت کو ترک کر کے ایک ایسا خوبصورت اظہار پیدا کیا ہے جو ان کا ہی خاصا نظر آتا ہے۔ انہوں نے یہ طریقہ اپنے شعری مجموعوں کا نام رکھنے میں بھی اختیار کیا ہے۔ ان کی یہ ترکیبیں قاری کو پہلی نظر میں ہی متاثر کر دیتی ہیں: جنت بستی، برف رتوں کی آگ، برف شگوفے، چنار چہرے، شعر آسمان، برف آفتاب، شہر گماں وغیرہ اس طرز کی کامیاب مثالیں ہوسکتی ہیں۔ یہ سب تجربات لاریب اردو زبان کے ساتھ ان کے والہانہ لگاؤ کو ظاہر کرتے ہیں۔

زندہ رہ جائے گی منظورؔ زبانِ اردو چاہنے والا کوئی اسکا رہے یا نہ رہے[۴۰]

حکیم منظورؔ اردو کی ترقی اور بقا کے لیے بے حد فکر مند تھے۔ ایک مضمون میں وہ دلچسپ انداز میں ایک خوبصورت تبصرہ کچھ اس طرح حوالہ قرطاس کرتے ہیں:

> ''میں اردو زبان ہوں۔ افسوس اس بات کا
> ہے کہ اردو پریس متحد ہو کر میرے تحفظ اور
> فروغ کے لیے کوئی ٹھوس کام نہیں کر رہا۔۔۔

حکومت کو جھنجھوڑنا اور لوگوں کے
ضمیر جگانا اگر یہاں اخبار والے نہیں کریں
گے جن کی عزت و آبرو اور معاش کا وسیلہ میں
ہوں تو یہ ذمہ داری کون پوری کرے گا؟ اسی
سوال کا جواب یا ثواب اخبار والوں اور
میرے قلم کاروں کو متحد کر کے میری بقا کیلئے
معنی خیز جدوجہد کا آغاز کرنے پر آمادہ کرے گا۔"[۴۱]

حکیم منظور اگر چہ کشمیری تھے اس کے باوجود ان کے اندر برصغیر کی ثقافت اور ادب کیلئے ایک عجیب کشش موجود تھی۔ ان کا اردو لہجہ کشمیری آمیز تھا جس سے وہ بخوبی واقف بھی تھے اور انہوں نے اپنے لہجے میں تصنع اختیار کرنے کی کبھی بھی کوئی کوشش نہیں کی۔ وہ خود کہتے ہیں کہ "مجھے ذاتی طور پر احساس ہے اور بجا طور پر کہ میرے لہجے اور اسلوب کے ساتھ ساتھ میرے فکر کے تانے بانے بھی اسی سرِ زمین سے پیوست ہیں۔"[۴۲] انہوں نے ہمیشہ اردو اور کشمیری زبانوں کی ترقی کیلئے کوششیں کیں۔ وہ ہر ایک زبان کو ترقی دینے کے سخت حامی تھے تاہم وہ اس کی آڑ میں "دکانیں کھولنے" کے شدید مخالف تھے۔ کشمیری زبان کی ترویج کے بارے میں وہ رقمطراز ہیں:

''ہم عاجزی کے ساتھ یہ دردمندانہ
استدعا کرنا چاہتے ہیں کہ کشمیری زبان
کونصاب تعلیم میں شامل کروانے کیلئے
کمیٹیاں نہیں بلکہ نتیجہ خیز اقدامات کی تفصیل
تیار کی جائے اوراس کوکسی فرد یا جماعت کا
معاملہ اور ماجرا بنانے کے بجائے اجتماعی
طور پر کشمیریوں کا مسئلہ اور معاملہ
بنانا چاہیے۔کشمیری زبان کے نام پر دکانیں
کھولنے اوراس زبان کا استحصال کر کے ذاتی
منفعت کے سامان کرنے سے اجتناب از
بس ضروری ہے۔''[۴۳]

جہاں تک حکیم منظور کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لینے کا تعلق ہے اس میدان میں ابھی سنجیدہ کام کرنا باقی ہے۔ ابھی تک صرف کشمیر یونیورسٹی سے ایم فل کا ایک مقالہ تیار ہوا ہے جس کا عنوان ''حکیم منظور کی شاعری: ایک تنقیدی جائزہ ہے''۔مقالہ نگار مبینہ اختر نامی ریسرچ اسکالر ہیں اور مقالہ پروفیسر مجید مضمر کی نگرانی میں تیار ہوا ہے۔اس قلیل توجہی کی اصل وجہ یہ ہے کہ ابھی حکیم منظور کے کلام کو اردو کے اعلیٰ پایہ

اور قد آور نقادوں نے بالاستیعاب اپنی نظر میں نہیں لایا ہے۔اس کے اورکئی اسباب ہو سکتے ہیں ۔جن میں جغرافیائی حد بندی، معاصرانہ چشمک اور اردو میں بلند پایہ نقادوں کی کمی وغیرہ بھی قابل ذکر ہیں ۔تاہم کچھ اہل فن نے حکیم منظور کے کلام کو پرکھنے کی کوشش کی ہے اورکئی اہم مباحث قاری کے سامنے لایے ہیں۔ان مباحث کومختصراً چند جملوں میں پیش کرتا ہوں تا کہ مستقبل میں ان نکات پر مزید سوچا جا سکے۔

ا۔حکیم منظور کی غزلوں میں داخلیت کے بجائے خارجی عناصر کا زبردست غلبہ ہے؛

۲۔ناسخ کی طرح ان کی شاعری دل سے زیادہ دماغی کوشش کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔اگرغور سے دیکھا جائے تو وہ آورد کی اپج معلوم ہوتی ہے اوراس پرکرافٹ کا شبہ گزرتا ہے؛[۴۴]

۳۔ان کے کلام میں جذبات اور احساسات کوغیرضروری شدت کے ساتھ قارئین کے سامنے رکھا گیا ہے جوان کی شاعری کو یک رنگی بنا دیتا ہے؛

۴۔ ان کی رباعیوں میں موضوعی اعتبار سے تنوع نہیں پایا جاتا ہے؛

۵۔ان کا کلام ایک ہی خیال کو مختلف الفاظ میں قاری کے سامنے لاتا ہے۔یعنی ان کے کلام میں خیال کی بیجا تکرار ملتی ہے؛

۶۔ان کے کلام کی معنوی پہلوداری کو دیکھنا اور اس کو سامنے لانا بھی ایک تجزیہ نگار اور مضبوط شارح کی ذمہ داری ہے؛

۷۔ان کے استعارات،تشبیہات، علامتوں اور ترکیبوں پہ کام کرنے کی کافی گنجائش ہے جس سے ان کے اشعار میں موجود معنی کی پہلوداری سے بھی پردہ اٹھ جائے گا؛

۸۔ان کے کلام میں کشمیر سے متعلق مختلف مضامین کی اتنی بھرمار ہے کہ ان کی شاعری مقامی بن چکی ہے اور غیر کشمیری کے لیے زیادہ اپیل نہیں رکھتی؛

ڈاکٹر پریمی رومانی کا یہ کہنا کہ منظورؔ کی شاعری میں قوم پرستی اور وطن پرستی کا احساس بھی ہوتا ہے۔''[۴۵] منظورؔ پر بہت بڑا ظلم ہے۔رومانی نے جس جذبہ کو قوم پرستی یا وطن پرستی کہا ہے وہ دراصل ایک انسان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت کیا ہوا فطری حبّ الوطنی کا جذبہ یا قوم کے تئیں ہمدردی کا عنصر ہے جو اگر حد اعتدال سے ہٹ گیا تو قوم پرستی میں تبدیل ہوجاتا ہے۔حکیم منظورؔ بھی انہی فطری جذبوں کے تحت اپنی سرزمین سے جڑے رہے ہیں اور اس کی بات بھی کرتے ہیں۔ان میں وہ تعصب اور

معاندانہ جذبہ نظر نہیں آتا جو وطن پرست شاعروں میں اکثر دیکھا جاتا ہے۔

غرض ہر ایک انسان دوسرے انسان سے مختلف ہے۔اس کا فہم، ماحول اور صلاحیتیں دوسرے شخص کے ہو بہو نہیں ہو سکتیں۔ فنکار سب سے پہلے ایک انسان ہے۔ اسی لیے اس کا زاویہ نگاہ دوسرے فنکار سے مختلف ہوا کرتا ہے۔ یہ حقیقت فطری ہے کہ ہر ایک فنکار کا فن پارہ دوسرے فن کار کے فن پارے سے اسلوب، خیال، فکر وغیرہ میں مختلف ہوتا ہے۔ اپنی ذات اور گرد و پیش میں رونما ہو رہے واقعات اور حادثات کا اثر لے کر ان کو خوبصورتی کے ساتھ بیان کرنا کسی بھی فنکار کی مجبوری ہے۔حکیم منظورؔ ہمارے دور میں ایک ایسے عظیم شاعر، صحافی اور منتظم گزرے ہیں جو نہایت حساس تھے اور اپنے گرد و پیش میں ہو رہی تبدیلیوں کو سنجیدگی کے ساتھ اپنی گرفت میں لیتے تھے۔ان کا کوئی بھی فن پارہ اپنی ایک الگ پہچان رکھتا ہے کیونکہ حکیم منظورؔ کے سوچنے کا اپنا ایک الگ زاویہ ہے اور اپنا ایک مختلف رنگ ہے۔

منظورؔ میری آنکھ کے ہیں زاویے الگ   گرداب کو میں کہتا ہوں طوفان ہے رقص میں [۴۶]

حکیم منظورؔ نے طویل علالت کے بعد ۱۷ برس کی عمر میں ۲۱ دسمبر ۲۰۰۶ء کو رحلت فرمائی۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔آمین۔

حوالہ جات و حواشی

۱۔حکیم منظور،حکیم منظور،لہولمس چنار،بھوپال،انڈیا بک ایمپوریم، ۱۹۸۲ء،ص۱۰۰۔

۲۔حکیم منظور کی تاریخ پیدائش میں اختلاف ہے۔پروفیسر مجید مضمر مرحوم نے جو مقالہ ان کی شخصیت اور شاعری پر ان کی موجودگی میں پڑھا تھا اس میں انہوں نے ان کی تاریخ پیدائش ۱۷جنوری ۱۹۳۷ء کہی تھی اور حکیم منظور نے کوئی اعتراض بھی نہیں کیا تھا۔(ملاحظہ ہو رنگ باتیں کریں از ڈاکٹر مجید مضمر،سری نگر،یاور پبلی کیشنز،تاریخ ندارد،ص۹۳۔)

۳۔حکیم منظور، پھول شفق آنگن کے،دہلی،۳جنوری ۱۹۹۳ء،ص۳۔

۴۔ حکیم منظور،برف رتوں کی آگ،دہلی،مطبوعہ عارض آفسٹ پریس،۱۹۹۰،ص۶۳۔

۵۔ڈاکٹر مجید مضمر،رنگ باتیں کریں،سری نگر،یاور پبلی کیشنز،تاریخ ندارد، ص۹۵۔

۶۔حکیم منظور،شعر آسمان،نئی دہلی،مکتبہ معارض،تاریخ ندارد،ص۱۰۷۔

۷۔حکیم منظور،شعر آسمان،ص۱۰۸۔

۸۔حکیم منظور،''سطح بینی وجہہ خلط مبحث''،شیرازہ، مدیر: محمد اشرف

ٹاک، سری نگر، کلچرل اکیڈیمی، ج ۴۶، شمارہ ۴-۷، ص ۲۲۴-۲۳۱۔

۹۔ حکیم منظور، سخنِ برف زاد، ۲۰۰۳ء، بہ قلم خود، ص ۳۔ یہاں یہ بات واضح کرنی مفید معلوم ہوتی ہے کہ اس بے رخی کے باوجود بھی منظورؔ کی قدآور شخصیت کئی مقامات پر تسلیم کی گئی۔ مثلاً حکیم منظورؔ پندرہ برس تک بزم فروغ اردو جموں کے صدر، کُل ہند اردو رائیٹرس اینڈ ایڈیٹرس فورم کے نائب صدر، انجمن ترقی اردو کے نائب صدر، کل ہند اردو ہندی سنگم کشمیر کے کنوئنر رہنے کے علاوہ کئی اداروں اور انجمنوں سے منسلک رہے۔ موصوف کو جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف کلچر اینڈ لینگویجز، ویسٹ بنگال اردو اکادمی، اتر پردیش اردو اکادمی، مہجور فاؤنڈیشن کشمیر کی طرف سے بھی کئی اعزازات سے نوازا گیا جو اردو ادبی دنیا میں ان کے مقام پر دال ہے۔

۱۰۔ پروفیسر قدوس جاوید، ''حکیم منظور: بحیثیت غزل گو''، شیرازہ، مدیر: محمد اشرف ٹاک، سری نگر، کلچرل اکیڈیمی، ج ۴۶، شمارہ ۴-۷، ص ۳۵۔

۱۱۔ برف رتوں کی آگ، ص ۲۳۔

۱۲۔ حکیم منظورؔ، برفآ فتاب، سری نگر، مطبع شالیمار آفسٹ پریس، ۲۰۰۰ء، ص ۱۳۳۔

۱۳۔ حکیم منظورؔ، برفآ فتاب، سری نگر، مطبع شالیمار آفسٹ پریس، ۲۰۰۰ء، ص ۱۳۳۔

۱۴۔حکیم منظور، پھول شفق آنگن کے، دہلی، ۳ جنوری ۱۹۹۳ء، ص ۴۔
۱۵۔ڈاکٹر مجید مضمر، رنگ باتیں کریں، سری نگر، یاور پبلی کیشنز، تاریخ ندارد، ص ۱۰۲۔
۱۶۔برف آفتاب، ص ۱۴۴۔
۱۷۔ڈاکٹر مجید مضمر، رنگ باتیں کریں، سری نگر، یاور پبلی کیشنز، تاریخ ندارد، ص ۱۰۲۔ نیز مضمر صاف قبول کرتے ہیں کہ ''حکیم منظور کا سارا کلام اسی نوع کا نہیں۔ کاغذی بادام اور کاغذی اخروٹ کا بھی اپنا مزہ ہے اور اس قسم کے اشعار ان کے یہاں بہترے ہیں۔'' (رنگ باتیں کریں، ص ۱۰۲)
۱۸۔شعر آسمان، ص ج۔
۱۹۔حکیم منظور، چہار ضرب، سری نگر، خبر و نظر پبلی کیشنز، ص ۶۔
۲۰۔حکیم منظور، چہار ضرب، سری نگر، خبر و نظر پبلی کیشنز، ص ۱۷۔
۲۱۔حکیم منظور، قلم :زبان: شگاف، سری نگر، مطبع شالیمار آرٹ پریس، ۲۰۰۵ء، ص ۳۲۔
۲۲۔قلم: زبان: شگاف، ص ۳۴۔
۲۳۔برف آفتاب، ص ۱۲۶۔
۲۴۔برف آفتاب، ص ۱۳۵۔
۲۵۔برف آفتاب، ص ۱۳۶۔

۲۶۔حکیم منظور،سخنِ برف زاد، بہ قلم خود،ص۲۔
۲۷۔ڈاکٹر مجید مضمر،رنگ باتیں کریں،سری نگر، یاور پبلی کیشنز،تاریخ ندارد، ص۱۰۰-۱۰۱۔
۲۸۔ڈاکٹر مجید مضمر،رنگ باتیں کریں،سری نگر، یاور پبلی کیشنز،تاریخ ندارد، ص۱۰۱۔
۲۹۔بحوالہ محمد اشرف ٹاک،''حکیم منظور:اکابرین کی نظر میں''،شیرازہ،مدیر: محمد اشرف ٹاک،سری نگر،کلچرل اکیڈیمی،ج۴۶،شمارہ۴-۷،ص۱۸۹۔
۳۰۔برف رتوں کی آگ،ص۲۶۔
۳۱۔حکیم منظور،قلم:زبان:شگاف،سرینگر،نومبر۲۰۰۵ء،ص۳۱۔
۳۲۔حکیم منظور، پھول شفق آنگن کے،دہلی،جنوری۱۹۹۳ء،ص۵۸۔
۳۳۔حکیم منظور،سخنِ برف زاد۔
۳۴۔لہولمس چنار،ص۱۷۔
۳۵۔لہولمس چنار،ص۱۰۱۔
۳۶۔لہولمس چنار،ص۸۸۔
۳۷۔لہولمس چنار،ص۱۰۲۔
۳۸۔لہولمس چنار،ص۱۱۸۔
۳۹۔لہولمس چنار،ص۱۱۶۔

۴۰۔قلم: زبان: شگاف، ص۱۴۔

۴۱۔خبر ونظر، شمارہ ۱۳ جولائی ۱۹۹۷ء۔

۴۲۔حکیم منظور، سخنِ برف زاد، بہ قلم خود، ص۲۔

۴۳۔حکیم منظورؔ (مدیر اعلیٰ)، ہفت روزہ سہ لسانی 'خبر ونظر'، سری نگر، شمارہ ۱۴ جون ۱۹۹۸ء۔

۴۴۔منظورؔ نے شاعری میں کرافٹ کے لیے جو ''قافیہ پیما'' کی ترکیب استعمال کی ہے وہ بھی بے اضافت لائی ہے۔

شاعر ہیں تو بس قافیہ پیما سارے
دل تنگ ہیں ارباب تمنّا سارے
استثناء اِس میں ہے بھی منظورؔ مگر
بے کیف ہیں اندر سے ہیں صحرا سارے

(حکیم منظور، چہار ضرب، سری نگر، خبر ونظر پبلی کیشنز، ص۱۶۴۔)

۴۵۔ڈاکٹر پریمی رومانی، ''حکیم منظور: عصر حاضر کا ایک نمائندہ غزل گو شاعر''، شیرازہ، مدیر: محمد اشرف ٹاک، سری نگر، کلچرل اکیڈیمی، ج۴۶، شمارہ ۴-۷، ص۱۶۳۔

۴۶۔قلم: زبان: شگاف، ص۱۸۔

☆☆☆